(غلام گردش)

چار گھنٹے کا بچہ!

دشت اے برچی، کابل کے مغربی حصہ میں ایک ہسپتال ہے۔ سرکاری ہسپتال۔ افغان حکومت کے ساتھ ساتھ ایک مغربی رفاعی ادارہ Medecins Sans Frontieres چلا رہا ہے۔ رفاعی ادارہ بنیادی طور پر اس ہسپتال میں زچہ بچہ وارڈ اور لیبر روم کی دیکھ بھال کر رہا ہے۔ یورپ سے تعلق رکھنے والی اس این جی او کی عملی کوشش ہے کہ افغانستان میں خواتین کو بہتر طبی سہولتیں مہیا کی جائیں۔ برچی ہسپتال ویسا ہی ہے، جیسا ایک سرکاری ہسپتال ہوتا ہے۔ آدمی اور عورتوں سے بوجھل۔ وسائل کی شدید کمی کا شکار۔ مگر اسکا زچہ بچہ وارڈ کافی بہتر چل رہا ہے۔ اس میں افغانی ڈاکٹرز اور نرسیں بھی ہیں اور ساتھ ساتھ غیر ملکی ڈاکٹر بھی کام کر رہے ہیں۔ کسی بھی ہسپتال کی طرح، یہ ایک غیر متنازعہ جگہ ہے۔ مگر آج سے ٹھیک چار دن قبل، وہاں دہشت گردی کا ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ یہ ہسپتال پوری دنیا کی نظروں میں آ گیا۔ عبرت، موت اور ظلم کا نشان بنکر۔ صبح دس بجے، پولیس کی یونیفارم میں ملبوس چند لوگ اندر داخل ہوئے۔ انکے پاس بھاری اسلحہ موجود تھا۔ کسی کو بھی اندازہ نہیں ہوا کہ یہ اصل پولیس اہلکار نہیں بلکہ دہشت گرد ہیں۔ نومولود بچوں کے وارڈ میں داخل ہوتے ہی ان اہلکاروں نے عورتوں، بچوں اور میڈیکل سٹاف پر بے دریغ فائرنگ شروع کر دی۔ مقابلہ کرنے کیلیئے وارڈ میں کسی کے پاس کوئی غلیل تک نہیں تھی۔ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ کوئی پتھر دل اس حد تک ظلم کریگا کہ یہاں بھی خون کی ہولی کھیلنے کیلیئے تیار ہو جائیگا۔ مگر جو قطعاً نہیں سوچا گیا تھا، وہی ہوا۔ پولیس کی وردی میں چھپے ہوئے درندوں نے اس وارڈ میں قیامت برپا کر دی۔ اندازہ لگایئے۔ نہتی عورتیں مرنے کے علاوہ کیا کر سکتی تھیں؟ نومولود بچے کیا مزاحمت کر سکتے تھے؟ جب تک حکومتی ادارے مقابلے کیلیئے آئے اس وقت تک بارہ مائیں، دو نومولود بچے اور دس بارہ عملے کے لوگ مارے جا چکے تھے۔ ان نومولود بچوں میں ایک بچہ چار گھنٹے کا تھا۔ دوسرے کی عمر صرف اور صرف بارہ گھنٹہ تھی۔ دو سو چالیس منٹ کی عمر کے بچے کا نام ''اُمید'' تھا۔ یہ نام اسکی ماں نے پیدا ہونے کے فوری بعد رکھا تھا۔ ماں کی عمر تقریباً پچیس برس تھی۔ شادی کو سات برس گزر چکے تھے۔ مگر بے اولاد تھی۔ علاج کیلیئے ہر ماہ، گھر سے اس ہسپتال میں آتی تھی۔ اُمید، تقریباً ڈیڑھ سال کے علاج کے بعد پیدا ہوا۔ دہشت گردی کے اس واقعہ میں، اُمید کی والدہ ماری گئی۔ چار گھنٹے کا بچہ تو خیر پیدا ہی مرنے کیلیئے ہوا تھا۔ کسی بھی وجہ کے بغیر۔ بچے نے واپس جا کر خدا سے پوچھا ضرور ہوگا کہ اے باری تعالیٰ، تو نے صرف چار گھنٹے کیلیئے دنیا میں کیوں بھیجا تھا۔ کس لیے، کس کے کیلیئے۔

دہشت گردی کا یہ حالیہ واقعہ چار دن قبل کابل میں پیش آیا۔ المناک واقعہ پر ساری دنیا اشک بار ہے۔ اب تک کسی بھی گروہ نے اس واقعہ کی ذمہ داری قبول نہیں کی۔ ویسے کر بھی لے تو اسکا کیا بگاڑا جا سکتا ہے۔ افغان حکومت بہر حال طالبان کی طرف انگلیاں اُٹھا رہی ہے۔ مگر طالبان نے کسی قسم کی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ اب تک، زچہ بچہ وارڈ میں اٹھارہ نومولود بچے ایسے بھی تھے، جنکے والدین کے متعلق قطعی طور پر کہنا حد درجے مشکل تھا۔ انکی کلائی میں ماں کا نام پلاسٹک کی ایک ڈوری سے لکھا ہوا تھا۔ مگر اکثر بچوں کی ماؤں

کا کوئی پتہ نہیں تھا۔ جب لواحقین کو حادثہ کا علم ہوا، تو فوری طور پر ہسپتال پہنچ گئے۔ ہسپتال انتظامیہ کیلئے یہ حد درجہ مشکل مرحلہ تھا۔ سینکڑوں لوگ ہسپتال کے باہر ان بچوں کا انتظار کر رہے تھے۔ جنکو انہوں نے نہ کبھی دیکھا تھا اور نہ ہی انہیں پہچان سکتے تھے۔ ان بچوں کی کلائی پر پلاسٹک کی ڈوری وہ واحد ذریعہ تھی، جس سے کچھ بنیادی شناخت ہو سکتی تھی۔ افغانستان کی سوسائٹی میں لوگ پسند نہیں کرتے کہ انکی اہلیہ کا نام کہیں بھی لیا جائے۔ مگر اب کوئی چارہ نہیں تھا۔ ماؤں کے ناموں سے بارہ بچوں کو خاندان کے مردوں کے حوالے کر دیا گیا۔ چھوٹے چھوٹے بچے، پھٹی ہوئی آنکھوں سے ہر طرف دیکھ رہے تھے۔ انکے شعور سے باہر تھا کہ پیدائش سے چند گھنٹوں بعد، دنیا کے اس حصہ میں انکے ساتھ کتنا بڑا ظلم ہو چکا ہے۔ انہیں کس گناہ کی سزا ملی تھی۔ اسکے متعلق کچھ کہنا عبث ہے۔ ان معصوم بچوں نے کیا گناہ کیا ہوگا۔ پر نہیں صاحب، ایک ایسا گناہ ضرور کیا جس پر انکا کوئی کنٹرول نہیں۔ دنیا کے اس علاقہ میں پیدا ہونا، جو چالیس سال سے ہر روز برباد ہو رہا ہے، پامال ہو رہا ہے۔ واقعی ایک بہت بڑا ناکردہ گناہ ہے۔ آج بھی برچی ہسپتال میں چھ بچے ایسے ہیں، جنہیں لینے کیلئے کوئی خاندان نہیں آیا۔ وہ بچے آج بھی اسی ہسپتال کے اندر لاوارث پڑے ہوئے ہیں۔

اس حادثہ کا ارتعاش پوری دنیا میں محسوس کیا گیا۔ افغانستان، جہاں خودکش بم دھماکے، لاشیں، حادثے اور قبرستانوں کے علاوہ کچھ بھی نہیں رہا۔ وہاں سے بھی غم وغصہ اور دکھ کی لہریں پوری دنیا کے سنجیدہ ذہنوں کو منجمد کرتی گئیں۔ نومولود بچے، حاملہ خواتین، نہتی مائیں، یہ کس طرح کسی کے دشمن ہو سکتے ہیں؟ اسکا جواب شائد کبھی نہ ملے۔ مگر انسانی رویہ بھی حد درجہ عجیب ہے۔ جہاں ظلم ہی ظلم ہے، وہاں رحم دل انسان بھی سانس لے رہے ہیں۔ کابل سے ہی، بہت سی خواتین اس وارڈ میں آ گئیں۔ رضا کارانہ طور پر بچوں کی دیکھ بھال شروع کر دی۔ کچھ خواتین نے ان معصوموں کو اپنا دودھ پلانا شروع کر دیا۔ ایسے افسوسناک مناظر تھے کہ ہر دیکھنے والے کی آنکھ اشک بار ہو جاتی تھی۔ پوری دنیا سے مزاحمتی بیان جاری کیے گئے۔ ایسے لگتا ہے کہ بے جان سے مزاحمتی بیانات پہلے سے لکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ تاریخ اور عنوان تبدیل کر کے جاری کر دیے جاتے ہیں۔ یہ بیانات بذاتِ خود مردہ نظر آتے ہیں۔ کسی بھی انسانی جذبے کے بغیر۔ بہر حال اس سانحے نے پوری دنیا کو تھوڑی دیر کیلئے غم زدہ ضرور کیا ہے۔ اجتماعی شعور پر دستک ضروری ہے کہ یہ سب کچھ کیوں روا ہے۔

افغانستان کیسے برباد ہوا یا کیا گیا۔ یہ ایک تاریخی المناک سچی کہانی ہے۔ اسے جنگ میں کیسے دھکیلا گیا۔ یہ بھی سب کے سامنے ہوا۔ سوال ہے کہ کیا افغانستان، ہمیشہ سے خون ریزی اور خودکش دھماکوں کا شکار رہا۔ آپکو جان کر حیرانی ہوگی کہ ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔ افغانستان ایک امن سے بھرپور ملک تھا۔ جہاں زندگی اپنے خوبصورت ترین رنگوں میں موجود تھی۔ ڈاکٹر ولیم پوڈلیچ (Dr. William Podlich) ایری ذونا یونیورسٹی کے پروفیسر تھے۔ چار دہائیاں پہلے یونیورسٹی سے چھٹی لی۔ بیوی اور بچیوں کو ساتھ لیکر کابل آ گئے۔ قیام کے دوران، چار دہائیاں پہلے کے کابل کی تصاویر کھینچنی شروع کر دیں۔ دراصل وہ ایک نیم ماہر فوٹوگرافر تھے۔ ولیم نے اس شہر کی سینکڑوں نہیں، ہزاروں تصاویر کھینچی۔ کچھ عرصہ قبل، ولیم کے داماد، کلے ٹن ایسٹرسن (Clayton Esterson) نے انٹرنیٹ پر شائع کر دیں۔ یہ تصاویر اس کابل کا پتہ دیتی ہیں، جسکا اب کوئی وجود نہیں ہے۔ کابل، باغات، جھرنوں، خوبصورت کیفوں کا شہر تھا۔ غیر ملکی

سیاح اَن گنت تعداد میں موجود رہتے تھے۔اعلیٰ درجہ کی بسوں پر مشتمل مغربی ممالک کے کاروان ہر وقت افغانستان کے ہر حصے میں دکھائی دیتے تھے۔شائد نئی نسل کیلئے یہ حقیقت تسلیم کرنا مشکل ہو۔کابل میں مغربی لباس میں ملبوس مقامی خواتین اور مرد عام نظر آتے تھے۔علاقائی لباس اور پینٹ کورٹ کا ایک حسین امتزاج دکھائی دیتا تھا۔چمکتی ہوئی نئی گاڑیاں ہر طرف فراٹے بھرتی موجود تھیں۔یونیورسٹیاں، کالج، بہترین سکول ہر جانب دکھائی دیتے تھے۔مذہبی رواداری بھی معاشرہ کا خاصہ تھی۔سائیکلوں پر لڑکیاں ہر طرف نظر آتی تھیں۔افغانستان جنگ سے پہلے ایک حد درجہ خوبصورت ملک تھا۔

مگر سویت قبضہ کے بعد ہر چیز تبدیل ہوگئی۔امریکہ اور سویت یونین کی باہمی جنگ نے اس ملک کو موت کے کھنڈر میں تبدیل کر دیا۔جہاں پہلے باغات تھے، وہاں غلاظت کے ڈھیر لگ گئے۔جہاں پہلے، ہوٹل اور ریستوران تھے، وہاں موت نے ہر چیز خاموش کر دی۔تعلیمی درسگاہوں پر قفل لگ گیا۔لاکھوں شہری، افغانی فوجی مارے گئے۔اس ملک سے لوگ ہجرت کر کے پوری دنیا میں پھیل گئے۔ہمارے ملک میں دہشت گردی کی لہر، حقیقت میں بین الاقوامی قوتوں کی باہمی جنگ سے وارد ہوئی۔ہمارا ملک بھی جلنے لگ گیا۔اسی ہزار کے قریب لوگ لقمہ اَجل ہوئے۔ہمارا قومی مزاج تبدیل ہوگیا۔ہمسایہ ملک کے اندر جو آگ لگی تھی، پہلے تو ہم سمجھتے رہے کہ ہمیں کچھ نہیں ہوگا، ہم محفوظ ہیں۔یہ سب کچھ تو افغانستان میں ہو رہا ہے۔مگر اس آگ نے ہمیں بھی بھرپور طریقے سے لپیٹ میں لے لیا۔بچت کی واحد وجہ یہ تھی کہ ہمارے عسکری اداروں نے سمجھ لیا کہ ہر صورت میں دہشت گردوں کی سرکوبی کرنی چاہیے۔سیاسی قائدین کی ناسمجھی کے باوجود، ریاستی اداروں نے حد درجہ موثر طریقے سے دہشت گردوں کی بیخ کنی کی۔اس آگ کی چنگاریاں ابھی بھی ہمیں کے پی اور بلوچستان میں سلگتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔اپنے ملک میں مقامی اور بین الاقوامی طاقتوں کا کھیل مستقبل قریب میں ختم ہوتے نظر نہیں آرہا۔بہر حال اسے ممکن حد تک کم ضرور کر دیا گیا ہے۔

افغانستان میں جو کچھ ہوتا ہے، اسکا ردِعمل براہِ راست ہمارے ملک پر پڑتا ہے۔عمل اور ردِعمل کی ایسی جنگ شروع ہو جاتی ہے جس سے بچنا ہمارا قومی مفاد ہے۔برچی ہسپتال میں جو سانحہ پیش آیا۔اسکے بعد نیک جذبات کے تحت ہماری جانب سے اسکے سہولت کاروں کو پکڑنے میں بھرپور مدد ہونی چاہیے۔شائد پسِ پردہ، ہو بھی رہی ہو۔مگر بداعتمادی کے سائے ہر طرف موجود ہیں۔انجام کار کیا ہوگا۔یہ تو صرف قیاس آرائی کی حد تک گمان ہی ہوسکتا ہے۔مگر چار گھنٹے کے نومولود بچے، اُمید نے خدا سے اپنے قتل ہونے کی وجہ ضرور پوچھی ہوگی!

راؤ منظر حیات